محنت سے سینچی جانے والی زمین - پیداوار کا	۱/۳	۱/۳	۱/۱۰
کھجور، انگور، باغات وغیرہ	متعین مقداریں	متعین مقداریں	۱/۳ پیداوار
دولاب سے سینچی جانے والی زمین پیداوار کا[۱]	۱/۴	۱/۴	..
موسم گرما کی فصل[۲] - پیداوار کا	..	..	۱/۴

پہلی اور دوسری قسم کی زمینوں کیلئے امام ابو یوسف کی تجویز کردہ شرحیں سابق شرحوں سے کم ہیں۔ آخری قسم کے محصول کی شرح میں کوئی تبدیلی تجویز نہیں کی گئی ہے۔ اور تیسری قسم کے سلسلے میں ایک بنیادی اصلاح تجویز کی گئی ہے۔ اس اصلاح کے مصالح اوپر واضح کیے جاچکے ہیں۔ نیز نظام محاصل میں یکسانی پیدا کرنے کے لیے بھی یہ اصلاح ضروری تھی۔

امام ابو یوسف نے اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر اس بات کی صراحت کی ہے کہ ان کے زمانے کے حالات کے پیش نظر سابق شرحوں کے مطابق متعین مقداروں میں خراج وصول کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ اب وہ شرحیں کاشتکاروں کے لیے قابل برداشت نہیں رہ گئی ہیں[۳]۔

انھوں نے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے اس بات کے نظائر پیش کیے ہیں کہ بعض علاقوں میں کاشتکاروں کے ساتھ پیداوار میں شرکت کے اصول پر معاملہ کیا گیا تھا[۴]۔

امام ابو یوسف نے تحصیل محاصل کے انتظامی پہلو پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے درمیانی آدمیوں کو خراج کی تحصیل کا ٹھیکہ دینے کے طریقے کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ اس طریقے کو اختیار کرنے سے خراج ادا کرنے والوں پر ظلم و زیادتی کا دروازہ کھلتا ہے، زرعی سرگرمیوں میں کمی آتی ہے اور پیداوار کم ہوجاتی ہے، حکومت کی آمدنی بھی محدود ہوجاتی ہے اور رعایا بھی تباہ ہوجاتی ہے[۵]۔ طوالت کے خوف سے ہم نے اس موضوع پر ان کے فکر کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا ہے۔

---

[۱] و [۲] غالباً یہ دونوں قسمیں ایک ہی ہیں یعنی موسم گرما میں ہونے والی فصل دولاب کے ذریعہ سینچی جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو محمد ضیاء الدین الریس - الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ صفحہ ۱۲۴

[۳] کتاب الخراج صفحہ ۱۰۱، [۴] ایضاً صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶ [۵] ایضاً ص ۱۲۵، ۱۲۶

اوپر ہم نے صرف ایک مخصوص محصول کے سلسلے میں قاضی صاحب کے فکر کا جائزہ لیا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں دوسرے محاصل مثلاً زکوٰۃ، عُشر، جزیہ اور محاصل جنگی پر بھی گفتگو کی ہے۔ یہاں ان بحثوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی گنجائش نہیں، لیکن بعض ایسے نکات کا ذکر مفید رہے گا جن کا تعلق محاصل کے بارے میں ان کے عام فکر سے ہے۔

اوپر نقل کی ہوئی عبارت سے یہ واضح ہے کہ امام ابو یوسف کے نزدیک شرعاً ضروری ہے کہ خراج کی شرحیں کاشتکاروں کے لیے قابلِ برداشت ہوں، اور ان کی زمینوں کی پیداوار آسانی سے ان کا بار اٹھا سکتی ہو۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ شرحیں ہلکی ہونی چاہییں کیونکہ ہلکی شرحیں آبادی اور خوش حالی میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں[۱]۔

دوسرا اصول جس پر انھوں نے زور دیا ہے یہ ہے کہ ان محاصل کی شرحیں مرکزی حکومت کی طرف سے متعین ہونی چاہییں۔ مقامی عمّال حکومت اور محصلین خراج کو ان میں کمی بیشی کا اختیار نہیں ہونا چاہیے[۲]۔ مقامی افسروں کو اپنی طرف سے خراج میں اضافہ کرنے، کوئی اور محصول عائد کرنے، یا کسی عنوان سے مزید رقمیں یا غلہ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس ضمن میں وہ عمال حکومت کے لیے رعایا سے تحفے قبول کرنے کو بھی سختی سے منع کرتے ہیں[۳]۔

محاصل کے ہلکے اور قابلِ برداشت ہونے اور ان کے متعین ہونے کے ساتھ تیسرا اصول یہ ہے کہ ان کو سہولت اور نرمی کے ساتھ وصول کیا جائے۔ فصل تیار ہو جانے پر اس میں سے سرکاری حصہ وصول کرنے کا کام جلد از جلد انجام پا جانا چاہیے تاکہ غلہ کھلیانوں میں خراب نہ ہو، کاشتکاروں کا حرج نہ ہو اور ان کی زرعی سرگرمیاں متاثر نہ ہوں۔ غلہ تقسیم کرتے وقت ناپ تول ٹھیک پیمانوں کے ذریعے انصاف کے ساتھ کی جانی چاہیے۔ کاشتکاروں کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔ ضروری ہے کہ تقسیم پیمانوں کے ذریعہ ہو، تخمینے پر مبنی نہ ہو[۴]۔

---

[۱] کتاب الخراج صفحہ ۱۲۳ — [۲] ایضاً ص ۱۲۵

[۳] ایضاً صفحہ ۹۷، ۹۸، ۱۲۸، ۱۳۰ — [۴] ر صفحہ ۱۲۹، ۱۳۰

انھوں نے محاصل کی تحصیل میں سختی، بالخصوص مار پیٹ اور ایذا دہی سے کام لینے کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی ہے اور خلیفہ کو بار بار تاکید کی ہے کہ اس قسم کی زیادتیوں کا سدباب کریں[1]۔

امام ابو یوسف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ محاصل کی تحصیل پر بہت دیانت دار اور قابل اعتماد افراد مامور کیے جائیں جو اسلامی قانون کا علم بھی رکھتے ہوں[2] ان کو معقول مشاہرے دیے جائیں[3] ان کے طرزِ عمل پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔ جو محصل یا والی کسی بدعنوانی کا مرتکب ہو اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، جس افسر کے خلاف خیانت، غبن یا کسی بدکرداری کا الزام تحقیق کے ساتھ ثابت ہو جائے اسے برطرف کر دیا جائے اور آئندہ اسے کبھی کوئی عہدہ نہ دیا جائے[4]۔

محاصل کی تعیین، تخفیف، ان کی تحصیل میں نرمی سے کام لینے، اور محصلین کے لیے امانت، دیانت اور علم کی ضرورت پر زور دیتے وقت قاضی ابو یوسف نے ایک طرف تو آثار و احادیث سے استناد کیا ہے اور دوسری طرف مفادِ عامّہ اور انسانی حقوق کا حوالہ دے کر ان اصولوں کی اہمیت جتلائی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ انہیں اصولوں کی پابندی میں معاشرے کی مادّی اور روحانی فلاح بھی مضمر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"عدل پر قائم رہنے، مظلوم کے ساتھ انصاف کرنے اور ظلم و جور سے پرہیز کرنے میں جو اُخروی اجر ہے اس کے ماسوا اس سے ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہے اور خراج کی آمدنی بڑھتی ہے۔ برکت عدل کے ساتھ وابستہ ہے، ظلم و جور کے ساتھ برکت ختم ہو جاتی ہے۔ جو خراج ظلم و زیادتی کے ساتھ جمع کیا جاتا ہے اس سے ملک تباہ و بدحال ہو جاتے ہیں[5]۔"

۲۔ غلہ کا نرخ اور اس کی رسد۔

زرعی زمینوں کے محاصل پر گفتگو کے ضمن میں امام ابو یوسف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نرخ

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۴۷، ۱۴۰۔۱۴۴ [2] ایضاً ص ۱۲۷۔۱۲۸ [3] ایضاً ص ۱۳۵

[4] ایضاً ص ۱۳۲۔۱۳۳ [5] ایضاً ص ۱۳۲

ایک سطح پر نہیں قائم رہتا بلکہ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے، لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں:۔

"ارزانی اور گرانی کی کوئی متعین حد نہیں ہے جسے معلوم کیا جاسکے۔ یہ (نرخ کا) معاملہ اوپر آسمان سے طے ہوتا ہے، نہیں معلوم کہ یہ کس طرح طے پاتا ہے۔ ارزانی، غلہ کی فراوانی کے سبب نہیں ہوتی، نہ گرانی اس کی قلت کے سبب ہوتی ہے۔ نرخ کی ارزانی اور گرانی اللہ کے فیصلے اور اس کے حکم کے تحت ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلہ فراواں ہو مگر گراں ہو اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کم ہو مگر سستا ہو[۵]"

غالباً عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ غلہ کی گرانی اور ارزانی صرف اس کی رسد کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ جب غلہ زیادہ ہوتا ہے تو اس کا نرخ گر جاتا ہے، جب کم ہوتا ہے تو نرخ چڑھ جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے اس نظریے کی تردید کی ہے۔ ان کی تردید کی بنیاد ان کا یہ مشاہدہ ہے کہ بسا اوقات غلہ فراواں ہونے کے باوجود بھی گراں ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی رسد کم ہو مگر نرخ ارزاں ہو۔ اس مشاہدے کو وہ اس بات کی کافی دلیل خیال کرتے ہیں کہ غلے کے نرخ کے گھٹنے بڑھنے کا انحصار صرف اس کی رسد یا پیداوار پر نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو گراں نرخ کے ساتھ ہمیشہ غلہ کی رسد کی کمی اور ارزاں نرخ کے ساتھ ہمیشہ رسد کی فراوانی نظر آتی۔ چونکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسا نہیں لہٰذا عام خیال کو صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا نہ اس پر کسی سماجی پالیسی مثلاً نظامِ محاصل کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے، اس نکتہ کا ذکر اس بحث کے ضمن میں آیا ہے کہ متعین نقد رقم کی شکل میں زرعی محصول وصول کرنا مناسب ہے کہ نہیں۔ اس بحث کے لیے اتنا کافی تھا کہ غلہ کے نرخ اور اس کی پیداوار کے باہمی ربط پر گفتگو کی جائے۔ قاضی صاحب کے نزدیک غلہ کے نرخ (یا درہم کی قوتِ خرید) اور غلہ کی رسد اور پیداوار کے درمیان کوئی مضبوط ربط نہیں پایا جاتا۔

---

۵ کتاب الخراج ص۵۲

اِسی حقیقت کو انھوں نے اپنی اس رائے کی بنیاد بنایا ہے کہ متعین نقد رقم کی صورت میں زرعی محصول وصول کرنا انصاف کے تقاضوں کو نہیں پورا کر سکتا۔ کیونکہ متعین کی ہوئی رقم کبھی زیادہ غلّہ کے برابر ہوگی اور کبھی کم اور یہ کہنا ممکن نہیں کہ پہلی شکل پیداوار کی کمی اور دوسری شکل پیداوار کی کثرت سے وابستہ ہے۔

چونکہ غلّہ کے نرخ کا مسئلہ محض ضمناً سامنے آیا تھا لہٰذا ابویوسف نے اس پر مزید بحث نہیں کی ہے، نہ انھوں نے اس کا گہرا تجزیہ کیا ہے، انھوں نے رسد کے بالمقابل طلب کے حالات کی طرف توجہ کی ہے، نہ آمدنیوں میں کمی بیشی یا معاشرے میں مقدارِ زر کی کمی بیشی اور نرخ کے درمیان کوئی ربط تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بات یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کافی نہیں کہ ان عوامل پر ان کی نظر نہیں ہے۔ اس کی دلیل، علاوہ اس بات کے کہ ان کا اصل موضوع نرخ کے تعین کا مسئلہ نہیں ہے، یہ ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں احتکار کرنے والوں کی سرگرمیوں کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے جب کہ وہ اور ان سے پہلے کے فقہاء اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ احتکار کے نتیجہ میں نرخ گراں ہو جاتا ہے۔ مزید برآں ان سطروں سے ذرا پہلے، یہ خیال ظاہر کرتے وقت کہ متعین نقد رقم کی شکل میں زرعی محصول وصول کرنا خلافِ عدل ہے، وہ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اس سلسلے میں چند دوسرے عوامل کو بھی دخل حاصل ہے۔

اِن باتوں کے پیشِ نظر، اور ان کے اس بیان کو سامنے رکھتے ہوئے کہ "نہیں معلوم کہ یہ کس طرح طے پاتا ہے" ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک نرخ کا انحصار صرف اس کی رسد پر نہیں، وہ اس سلسلے میں بعض دوسرے عوامل کو بھی دخیل سمجھتے ہیں، مگر ان عوامل کا احاطہ نہیں کر سکے ہیں۔ اس رائے کو تجزیاتی اعتبار سے بہت وقیع نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امام ابویوسف کو اس باب میں نہ تو اپنے علمی مآخذ سے کوئی واضح رہنمائی ملی تھی، نہ وہ ارسطو کے تجزیے سے باخبر تھے۔ (جو خود ناقص تھا اور رسد و طلب کے تعامل پر مبنی تعیینِ نرخ کا نظریہ نہیں پیش کر سکا تھا)۔ رسد اور طلب کے

ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

[۱] شیمپٹر بحوالہ ص ۶

باہمی تعامل سے نرخ کی تعیین کا نظریہ امام ابو یوسف کے صدیوں بعد باقاعدہ شکل اختیار کر سکا[1]۔ خود مسلمان مفکرین میں ان کے بعد آنے والے علماء مثلاً ابن تیمیہ[2] اور ابن خلدون[3] کے یہاں ہمیں ان سے بہتر تجزیہ ملتا ہے۔

۴۔ ترقیاتی اسکیموں کی لاگت کس طرح پوری کی جائے۔

امام ابو یوسف نے "کتاب الخراج" کے ابتدائی صفحات میں اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی ذمہ داری ہے کہ اپنے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کرے وہ ملک کی معاشی فلاح کو اسلامی ریاست کا ایک مقصد قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ خلیفہ کو ایسے مشورے دیئے ہیں جن کا مقصد عوام کی مادی فلاح و بہبود ہے۔ چنانچہ انھوں نے خلیفہ کو مختلف ترقیاتی کاموں کا بھی مشورہ دیا ہے۔ دوسری صدی ہجری میں اسلامی مملکت کی معیشت ایک زرعی معیشت تھی امام ابو یوسف نے ہارون الرشید کو مشورہ دیا ہے کہ وہ نہریں تعمیر کرائیں اور پرانی اور از کار رفتہ نہروں کی مرمت اور صفائی کروا کے ان کو پھر سے جاری کریں[4]۔ سیلاب کی روک تھام کے لیے بند تعمیر کریں[5]۔ زیر آب زمینوں کی بازیافت کا اہتمام کریں[6] اور ہر وہ اقدام کریں جس میں کاشتکاروں کی بہبود مضمر ہو[7]۔

یہاں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو نہ کی جائے گی۔ ہماری بحث اس ضمن میں پیدا ہونے والے ایک مخصوص مسئلہ تک محدود ہو گی یعنی ان ترقیاتی اسکیموں کی لاگت کس طرح پوری کی جائے گی؟ ان سے متعلق جملہ اخراجات ریاست کے عام خزانے سے پورے کیے جائیں گے (جس میں خراج اور چنگی وغیرہ

---

[1] جہاں تک تعیین نرخ کے طریق کے بارے میں نظریہ کا سوال ہے اٹھارویں صدی سے قبل کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ شمپیٹر بحوالہ صفحہ ۳۰۵

[2] ملاحظہ ہو ان کا رسالہ الحسبۃ فی الاسلام

[3] عبد الرحمن ابن خلدون: مقدمہ فیصل فی اسعار المدن اور فصل فی المعاش و وجوہہ من الکسب و الصنائع اور دوسری متعلق فصلیں۔ [4] کتاب الخراج ص ۱۱۰ اور ص ۱۲۴، ۱۳۱ [5] ایضاً ص ۱۱۱ اور ۱۱۲ [6] ایضاً ص ۱۲۳ [7] ایضاً ص ۱۲۱

محاصل کی آمدنی جمع ہوتی تھی، یا ان افراد سے بھی کچھ وصول کیا جائے گا جن کو ان اسکیموں سے فائدہ پہنچنے والا ہو؟ ابو یوسف نے اس مسئلے پر بحث کی ہے اور اس سلسلے میں ایک اصول تجویز کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"میری رائے ہے کہ آپ خراج کے افسروں کو ہدایت کر دیں کہ جب ان کی عملداری کے کچھ لوگ ان کے پاس آکر یہ بتائیں کہ ان کے علاقے میں بہت سی قدیمی نہریں ہیں جو اب ناکارہ ہو گئی ہیں۔ اور نہر کے کسی جگہ بند ہو جانے کی وجہ سے، بہت سی زمینیں زیر آب آ گئی ہیں یا دلدل بن گئی ہیں۔ اور یہ کہ اگر وہ ان کی کھدائی اور صفائی کروا دیں اور ان میں از سر نو پانی جاری ہو جائے تو یہ ناکارہ زمینیں آباد کر لی جائیں گی اور اس طرح خراج کی آمدنی میں اضافہ ہو گا۔ تو ان کی یہ عرضداشت آپ کو ارسال کر دی جائے۔ پھر آپ کسی معتمد علیہ دیانت دار، صاحب صلاح و تقویٰ آدمی کو اس بارے میں جائزہ لینے کے لیے بھیجیے۔ یہ آدمی اس علاقے کے ثقہ، واقف کار اور صاحب بصیرت لوگوں سے معلومات حاصل کرے اور باہر کے تجربہ کار اور صاحب رائے افراد سے بھی مشورہ کرے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس جائزہ لینے والے، آدمی کی کوششوں سے اپنے ذاتی نفع کی ترویج یا نقصان کی تلافی نہ مقصود ہو۔ اگر سب کی یہ رائے ہو کہ اس اسکیم کو زیر عمل لانے میں فائدہ ہے اور خراج کی آمدنی میں بھی اضافہ کی توقع ہے تو آپ ان نہروں کی کھدائی اور صفائی کا حکم جاری کر دیجیے اور اس کام کے سارے مصارف کا بار بیت المال پر ڈالیے۔ ان اخراجات کا بار اس علاقے کے باشندوں پر نہ ڈالیے کیونکہ ان لوگوں کا خوش حال رہنا ان کے برباد ہو جانے سے بہتر ہے۔ اور ان کا آباد رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ مفلس ہو کر ادائے خراج سے، معذور ہو جائیں۔

"اپنی زمینوں اور نہروں کی درستی اور ترقی کے سلسلے میں اہل خراج کے ہر ایسے مطالبے کو پورا کیا جانا چاہیے جس سے ان کے مفادات و مصالح کی ترویج ہوتی نظر آئے بشرطیکہ اس

اس اسکیم پر عمل کرنے سے اس علاقے کے گردوپیش کے دوسرے گاؤں اور قصبات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو اگر ان کا مطالبہ پورا کرنے سے دوسروں کی پیداوار کم ہو جانے اور خراج کی آمدنی میں کمی ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اسے نہیں پورا کرنا چاہیے۔

"باشندگان سواد کو اگر اپنی ان بڑی نہروں کی کھدائی اور صفائی کی ضرورت پیش آئے جو دجلہ و فرات سے نکالی گئی ہیں تو آپ ان کی کھدائی اور صفائی کروا دیجیے۔ اس کے اخراجات کا بار بیت المال اور اہل خراج دونوں پر ڈالا جائے گا۔ سارا بار اہلِ خراج پر ڈال دینا صحیح نہ ہو گا۔

"رہیں وہ چھوٹی نہریں جن کے ذریعے لوگ اپنے کھیتوں، باغات، نخلستانوں، انگور کی کیاریوں، یا ترکاری کے کھیتوں وغیرہ تک پانی لے جاتے ہیں تو ان کی کھدائی اور صفائی کے اخراجات ان لوگوں کو خود برداشت کرنے ہوں گے۔ بیت المال پر اس سلسلے میں کوئی بار نہ ڈالا جائے گا۔

"دجلہ و فرات اور دوسرے بڑے دریاؤں پر گھاٹ، بند اور پانی نکالنے کی جگہوں کی تعمیر اور مرمت پر آنے والے مصارف کا پورا بار بیت المال پر ڈالا جائے گا۔ اہلِ خراج پر اس سلسلے میں کوئی بار نہ ڈالا جائے گا۔ کیونکہ یہ سارے مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے امور ہیں، اور ان کے مصالح کا تحفظ تمام تر امام کے ذمے ہے کیونکہ زمینوں کی بربادی کے اسباب ایسے ہی ہوتے ہیں[1] اور ان کی بربادی کا بُرا اثر خراج کی آمدنی پر پڑتا ہے لہٰذا ان سے متعلق تمام اخراجات بیت المال سے پورے کیے جائیں گے۔

"ان مصارف پر مال خرچ کرنے کا اختیار ایسے ہی ذمہ دار کے ہاتھ میں دیجیے جو خوفِ خدا رکھتا ہو۔ جس کی امانت داری قابلِ اطمینان اور جس کا مسلک قابلِ تعریف ہو اور جو اللہ کی رضا کے لیے اس سلسلے میں وہ کام کرے جو اسے کرنا چاہیے۔ خائن اور جائز و ناجائز

[1] یعنی بند کا ٹوٹ جانا یا پانی کا نکاس بند ہو جانا (صدیقی)

میں کوئی تمیز کیے بغیر کام کرنے والوں کو ذمہ داری نہ سونپیے۔ ایسا آدمی بیت المال کا روپیہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے اڑائے گا، خطرے کے مقامات کی مرمت نہیں کرے گا، یا ان پر پکا کام کرا کے انہیں مستحکم نہیں بنائے گا تاآں کہ وہاں سے پانی پھٹ پڑے گا اور عوام کے غلے، مکانات اور ان کی پوری پوری بستیاں ڈوب کر تباہ ہو جائیں گی۔

"ذمہ دار مقرر کر دینے کے بعد آپ کسی دوسرے آدمی کو اس ذمہ دار کی کارکردگی کا جائزہ لینے پر مامور کیجیے جو معاینہ کرے کہ یہ ذمہ دار خطرے کے مقامات پر کیا کام کروا رہا ہے۔ کن قابلِ مرمت جگہوں سے پانی پھٹ پڑتا ہے اور ایسا ہونے کی وجہ کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہاں پر کام لگوا کر جو اجرت دی گئی وہ بے نتیجہ ضائع گئی اور مرمت ناکارہ ثابت ہوئی۔ اس جائزے کے بعد آپ کو جو رپورٹ ملے متعلقہ افسر کے ساتھ اسی کے مطابق سلوک کیجیے۔ اس کے کام کی تعریف کیجیے یا اس کی مذمت کیجیے اور اس کے خلاف تادیبی کاروائی کیجیے۔"[1]

ایک دوسرے مقام پر دجلہ و فرات اور ان جیسے دوسرے دریاؤں سے آبپاشی کے حق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"دجلہ اور فرات اور ان جیسے تمام بڑے دریاؤں اور وادیوں میں سارے مسلمان یکساں شریک ہیں۔ ان سے وہ سینچائی کے لیے بھی پانی لے سکتے ہیں اور اپنے مویشیوں اور جانوروں کے پینے کے لیے بھی۔ کسی کو انھیں روکنے کا حق نہیں۔ ہر گروہ کو اپنی اراضی کھجوروں اور دوسرے درختوں کو سیراب کرنے کا حق ہے۔ پانی کو کسی کے لیے مخصوص کرنے اور کسی سے روک لینے کا طریقہ غلط ہے۔"

اگر کوئی اس بڑے دریا سے نہر نکال کر اپنی زمین تک لے جانا چاہے تو اگر ایسا کرنے سے دریا کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اسے ایسا کرنے کا حق نہیں ہو گا۔ البتہ

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۳۱۔۱۳۲۔ قوسین کے درمیان کی عبارت وضاحت مفہوم کی خاطر مترجم نے بڑھائی ہے۔

اگر کسی مضرت کا اندیشہ نہ ہو تو اسے ایسا کرنے دیا جائے گا۔

اگر یہ بڑے دریا جو سارے مسلمانوں کے لیے عام ہیں مرمت یا کھدائی کے محتاج ہوں تو اس کی ذمہ داری امام کے سر ہوگی۔

اگر ان کے بند ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو ان کی مرمت اور درستی بھی امام کے ذمہ ہوگی[1]

ان عبارتوں کی روشنی میں آب پاشی کے لیے نہروں کی تعمیر، مرمت اور صفائی پر آنے والے اخراجات کے بارے میں امام ابو یوسف کی رائے کا خلاصہ یہ ہے :-

۱ - دجلہ و فرات اور دوسرے دریاؤں کو آب پاشی کے قابل بنائے رکھنا، ان پر بندگاہ اور آب پاشی کے لیے پانی نکالنے کی جگہیں تعمیر کرنا اور ان کو اچھی حالت میں رکھنا ریاست کے ذمے ہے۔ ان کاموں کی پوری لاگت سرکاری خزانے سے ادا کی جائے گی۔

۲ - خراجی زمینوں کی آب پاشی کے لیے بالخصوص ایسے علاقوں میں جہاں نہروں کے ذریعے پانی نہ پہنچنے سے زمینیں بے کار پڑی ہوں، حسبِ ضرورت نہریں کھدوانا اور پرانی نہروں کی مرمت اور صفائی کرانا بھی ریاست کے ذمے ہے اور ان کے اخراجات بھی بیت المال سے پورے کیے جائیں گے۔

۳ - دوآبۂ دجلہ و فرات میں بڑے دریاؤں سے نکالی ہوئی نہریں، جن میں پانی جاری ہو، اگر کھدائی، مرمت اور صفائی کی محتاج ہوں تو یہ کام بھی ریاست انجام دے گی۔ البتہ ان کے اخراجات ریاست کے خزانے اور ان باشندوں کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں گے جن کو ان نہروں سے فائدہ پہنچتا ہو۔

۴ - ان بڑی نہروں کے پانی کو اپنے کھیتوں اور باغات تک پہنچانے کے لیے لوگ جو چھوٹی نہریں اور نالیاں تعمیر کرنا چاہیں ان کی لاگت خود ان لوگوں کو پوری کرنی ہوگی

لاگت کی تقسیم اور اس سلسلے میں مختلف قسم کی نہروں کے درمیان تفریق کرنے میں قاضی صاحب

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۶

نے جو اصول سامنے رکھے ہیں وہ واضح ہیں۔ کسی اسکیم کی لاگت ان لوگوں کے ذمے ہے جن کو اس سے فائدہ پہنچے۔ جہاں فائدہ عام ہے وہاں لاگت کی ذمہ داری بھی عام ہے اور عوام کے مرکزی خزانے کی حیثیت میں یہ عام ذمہ داری بیت المال پر ڈالی گئی ہے۔ مذکورۂ بالا پہلی قسم اسی اصول کے تحت آتی ہے۔ چوتھی قسم کی نہروں کے فوائد چونکہ مخصوص افراد تک محدود ہوں گے لہٰذا ان کی لاگت بھی انہیں کے ذمہ ڈالی گئی ہے۔

لاگت کی ذمہ داری عائد کرنے میں دوسرا اصول یہ مدنظر رکھا گیا ہے کہ متعلقہ افراد کو اس اسکیم سے اتنا مالی فائدہ پہنچ رہا ہو کہ وہ بآسانی اس کے اخراجات کا بار برداشت کریں۔ دوسری اور تیسری قسم کی نہروں کے درمیان تفریق اسی لیے برتی گئی ہے۔ اہلِ خراج کو آباد اور خوشحال رکھنا حکومت کا ایک مقصد قرار دیا گیا ہے اور اسی مقصد کے تحت دوسری قسم کی نہروں کی پوری لاگت بیت المال کے ذمے ڈالی گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان نہروں کی تعمیر کے بعد بہت سی ایسی زمینیں زیرِ کاشت لائی جا سکیں گی جو ان کے بغیر افتادہ پڑی رہتی ہیں۔ ان زمینوں کے زیرِ کاشت آنے سے مجوزہ نظامِ مقاسمہ کے تحت خراج کی آمدنی میں معتد بہ اضافے کی متوقع ہے۔ چونکہ نہروں کی تعمیر سے پہلے نہ یہ زمینیں زیرِ کاشت تھیں نہ ان کے مالکوں کو ان کے ذریعے کوئی آمدنی ہو رہی تھی لہٰذا ان پر اخراجات کا بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس کے برعکس تیسری قسم کی نہروں میں پانی جاری تھا اور لوگ عملاً ان سے فائدہ اٹھا کر کاشت کرتے اور نفع حاصل کرتے تھے۔ اس آمدنی کے پیشِ نظر ان کے لیے بآسانی ممکن تھا کہ ان نہروں کی درستی پر آنے والے اخراجات کا ایک حصہ خود پورا کر سکیں۔ ان نہروں کی مرمت اور صفائی کے پورے اخراجات ریاست کے ذمے اس لیے نہیں ڈالے گئے کہ اس عمل سے خراج کی آمدنی میں کوئی نیا معتد بہ اضافہ نہیں متوقع ہے۔ ان کی مرمت اور صفائی خراج کی موجودہ آمدنی کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اور اس کی مناسبت سے ان پر آنے والے اخراجات کا ایک حصہ ریاست کو پورا کرنا چاہیے۔

ترقیاتی اخراجات کی ذمہ داری کی یہ تقسیم ابو یوسف کی بصیرت اور انصاف پسندی کا ثبوت ہے۔ انھوں نے عام کاشتکاروں کے مفاد کے ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ کس قسم کی نہروں سے کس کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے اور کون اخراجات کی ذمہ داری اٹھانے کی استطاعت رکھتا ہے۔ استفادہ اور استطاعت کی اس متوازن رعایت کے ساتھ انھوں نے دوسری اور تیسری قسم کی نہروں کے درمیان جو تفریق برتی ہے وہ ان کی معاشی بصیرت پر گواہ ہے۔ اگر وہ پہلی اور دوسری قسم کی نہروں کی لاگت اہلِ خراج کے ذمے ڈالتے تو زرعی ترقی کے اس اہم کام میں رکاوٹ پیش آتی، اور اگر تیسری قسم کی نہروں کی مرمت اور صفائی تمام تر ریاست کے ذمے رکھتے تو نہ صرف یہ کہ اس پر بے جا بار پڑتا بلکہ کاشتکاران نہروں کی صفائی اور حفاظت کی طرف سے بے پروا ہو جاتے۔ اس طرح انھوں نے پہلی قسم کی نہروں میں اس بنیاد پر تفریق برتی ہے کہ اول الذکر کا افادہ عام ہے اور آخر الذکر کا افادہ متعین افراد اور گروہوں تک محدود ہے۔ اخراجات کی ذمہ داری تقسیم کرتے وقت انھوں نے اس فرق کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ مسئلے کے ان تمام پہلوؤں پر اگر ان کی نظر نہ ہوتی تو وہ اتنا متوازن فارمولا تجویز کر سکتے۔

اس بحث کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ ترقیاتی اخراجات کا بار ریاست کے ذمے ڈالتے وقت ابو یوسف اس آمدنی کا حوالہ دیتے ہیں جو ان زمینوں کے خراج سے حکومت کو ہوتی ہے۔ رعایا کے سلسلے میں حکومت کی ذمہ داریاں گناتے وقت اس سے وصول کیے جانے والے محاصل کے حوالے ابو یوسف نے بار بار دیئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک حکومت کا یہ حق کہ وہ اپنے شہریوں سے محاصل وصول کر سکتی ہے کوئی مطلق حق نہیں بلکہ ایک بامقصد حق ہے جس کے ساتھ کچھ فرائض بھی وابستہ ہیں۔ زرعی زمینوں کی پیداوار سے محصول وصول کرنے کا حق متقاضی ہے کہ ان زمینوں کو سیلاب یا پانی کی کمی کی وجہ سے برباد ہونے سے بچایا جائے اور ان کی آبپاشی کے لیے نہریں تعمیر کی جائیں۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مالیاتِ عامہ سے تعلق

رکھنے والے مسائل میں امام ابو یوسف کا فکر بہت پختہ اور بلند ہے وہ حکومت کی آمدنی اور اس کے اخراجات کو کسی محدود زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ اسے فلاح عامّہ اور ملک کی مجموعی بہبود و ترقی سے تعلق رکھنے والا ایک اہم شعبہ سمجھتے ہیں۔ آمدنی کے ایک ذریعے کے طور پر محاصل کا جائزہ لیتے وقت وہ اس کے ہر اہم پہلو پر غور کرتے ہیں محصول کن لوگوں سے لیا جائے، کتنا لیا جائے، کس طرح وصول کیا جائے اور وصول کرنے والے کن صفات کے حامل ہوں، ان سب پہلوؤں پر انھوں نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس طرح انھوں نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ حکومت کی آمدنی کن مدات پر صرف کی جانی چاہیے، کن لوگوں کے ذریعے صرف کرائی جانی چاہیے۔ ان مصارف کی نگرانی اور اس بات کا اہتمام کہ جس کام پر مال صرف کیا جائے وہ ٹھیک طور پر انجام پائے، کس طرح کیا جانا چاہیے۔ ان اخراجات میں وہ جہاں فوجیوں کی تنخواہوں اور سرحدوں کے استحکام کو شامل کرتے ہیں، وہاں زرعی معیشت کو ترقی دینے والی اسکیموں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ جگہ کی قلت کے باعث ہم زکاۃ و عُشر سے ہونے والی آمدنی اور اس کے مصارف کے سلسلے میں امام ابو یوسف کے مشوروں کا جائزہ نہیں لے سکے ہیں۔ ان کے ان مشوروں کے مطالعے سے ہماری اس رائے کو مزید سند ملتی ہے کہ وہ حکومت کے اخراجات کو فلاح عامہ کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ریاست کی ذمہ داریوں کے بارے میں ان کا تصور فلاحی ریاست کا تصور ہے اور ان کا تصور فلاح ایک جامع تصور ہے جس میں جس طرح عوام کی مادی اور معاشی بہبود، ان کو ظلم وجور سے بچانا اور آزادی کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرنا شامل ہے اسی طرح ان کی اخلاقی تطہیر اور روحانی تطہیر کا اہتمام بھی شامل ہے۔

مالیات عامہ سے متعلق جن بحثوں کا مطالعہ ہم نے پہلے اور تیسرے عنوانات کے تحت کیا ہے ان سے ابو یوسف کی تجزیاتی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اوپر ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ تجزیہ صرف اسباب وعوامل کی تعیین میں منحصر نہیں، اثرات ونتائج کی نشان دہی بھی ایک تجزیاتی عمل ہے۔ نظام محاصل پر گفتگو کرتے وقت امام ابو یوسف نے اس امر کی نشان دہی کی ہے

کہ زمین کے رقبے کی بنیاد پر متعین کیا جانے والا محصول زرعی توسیع میں مانع ہوتا ہے۔ جب کہ پیداواری شرکت پر مبنی محصول اس رکاوٹ کو دُور کر دیتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ غلہ کے نرخ کی تبدیلی متعین محصول کے بار کو کم یا زیادہ کرتی رہتی ہے جب کہ متناسب محصول (PROPORTIONAL TAX) کے بار پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انھوں نے ترقیاتی اسکیموں کی لاگت کی تقسیم کا جو فارمولا تجویز کیا ہے وہ ان اسکیموں کے افادے اور اس افادے سے پیدا ہونے والی استطاعت کے تجزیے پر مبنی ہے۔

اس مختصر مقالے میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم مالیات عامہ کے بارے میں امام ابو یوسف کے اس بلند فکر کا موازنہ ان کے زمانے اور اس کے بعد کے ان مفکرین سے کریں جو اسلامی مملکت کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک میں گزرے ہیں لیکن معاشی فکر کی جو تاریخیں ہمارے سامنے ہیں ان کی روشنی میں ہم یہ رائے پورے اطمینان کے ساتھ ظاہر کر سکتے ہیں کہ مقاصد کی یہ بلندی، سماجی قدروں کا یہ شعور، نظر کی یہ وسعت اور مالیات عامہ کے وظائف کا اتنا جامع تصور ان کے صدیوں بعد تک بھی مغرب و مشرق کے کسی مفکر کے یہاں نہیں ملتا۔